OPEN ACCESS
RUSHD
(Bi-Annual Research Journal of Islamic Studies)
Published by: *Lahore Insititute for Social Sciences, Lahore.*

ISSN (Print): 2411-9482
ISSN (Online): 2414-3138
Jan-June-2022
Vol: 3, Issue: 1
journalrushd@gmail.com**Email:**
OJS: https://rushdjournal.com/index

ڈاکٹر قاری تاج افسر[1]

رسم عثمانی اور قرآن حکیم کا اعجاز
(مصاحف عثمانیہ کے تناظر میں)

Rasm e Uthmani and the Miracle of Quran
(In the context of Ottoman Qurans)

Abstract

The Qur'an is considered by Muslims to be a miracle in itself, given its content, language, and preservation over the centuries. Its verses contain a wealth of knowledge about various subjects, including science, history, and morality, and are expressed in a unique and eloquent literary style. The Qur'an also contains many predictions and prophecies that have been fulfilled, adding to its credibility as a divine text. Additionally, the Qur'an has been perfectly preserved throughout history, with each word and letter still remaining exactly the same as when it was originally revealed to the Prophet Muhammad over 1400 years ago. This preservation is considered miraculous given the lack of technological advancements and widespread illiteracy at the time of its revelation, as well as the numerous wars and

1 اسٹنٹ پروفیسر، کلیہ اصول دین، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، پاکستان

conflicts that have taken place since then. Finally, the Qur'an's impact on the world, both historically and in the present day, is also seen as evidence of its miraculous nature. Its teachings have inspired countless individuals to better themselves and contribute to society, and its influence can be seen in the countless works of literature, art, and architecture that have been created in its name. In this article, the author has analyzed the miracle of the Qur'an within the framework of Rasm al-Uthmani.

Keywords: Rasm, Mushaf e Uthman, Miracle, Quran

قرآن کریم اسلام کی تمام سابقہ تعلیمات کا جامع اور مکمل اصول وضوابط پر مبنی پیغامِ الٰہی ہے، اور اسی پر پیغام الٰہی کی تکمیل ہوئی۔ اس کا ناگزیز تقاضا تھا کہ اس کا خطاب کل انسانیت کی طرف ہو۔ اس کی حفاظت کا خصوصی انتظام ہو، اور وہ تمام انسانی عقول پر حاوی ہو، اور ہر اعتبار سے نا قابل چیلنج دیا کہ

﴿قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا﴾[1]

”آپ اعلان کر دیجئے کہ اگر تمام انسان و جن قرآن حکیم جیسی کتاب لانے پر متفق بھی ہو جائیں، اور ایک دوسرے کی معاونت بھی کریں تو بھی وہ لا نہیں سکیں گے۔“

جب مخالفین کی طرف سے اس کا جواب نہ آیا تو یہی اعلان دس سورتیں لانے کے حوالہ سے کیا۔ ارشاد ہے:

﴿قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیٰتٍ﴾[2]

جب کوئی جواب نہ بن پڑا تو ایک سورۃ لانے کا چیلنج کیا گیا:

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ﴾[3]

---

1 سورة الاسراء: 88

2 سورة هود:13

3 سورة البقرة :23

ان تمام اعلانات کا جواب دینے کی بجائے انہوں نے جنگ اور سازشوں کے ذریعے سے مقابلہ کرنا چاہا، لیکن قرآن کے اس چیلنج کا جواب نہ دے سکے۔ یہ بات تو پوری امت کے ہاں مسلم ہے کہ قرآن حکیم معجزہ الٰہی ہے، البتہ معجزہ کی حقیقت کیا ہے؟ قرآن حکیم کن وجوہ میں معجز ہے؟ ہر زمانے اور ہر خطے کے لوگوں نے اس کو اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھا اور مختلف تعبیرات میں اس کی وضاحت کی۔ اس مقالے میں رسم عثمانی کے حوالے سے اعجاز قرآنی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ نیز علم الرسم کی تعریف، اہمیت، مصاحف صحابہ کا رسم کے حوالے سے مختصر جائزہ۔ معجزہ کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم اور قرآن حکیم کی وجوہ اعجاز کا مختصر ذکر کرتے ہوئے رسم الخط کے تناظر میں اس کے اعجاز پر گفتگو کی گئی ہے۔

علم الرسم کی تعریف

رسم لغت میں خط، کتابت اور نشان کے معنی میں آتا ہے۔ عرب کے ہاں "ثوب مرسم" اس کپڑے کو کہا جاتا ہے جس پر لمبے خطوط کے نشانات ہوں۔[1] لکھی ہوئی چیز کو رسم اس لیے کہتے ہیں کہ وہ ملفوظ کے نشانات ہوتے ہیں۔[2] علمی اصطلاح میں رسم دو قسم پر ہے:

1۔ رسم قیاسی　　　2۔ رسم سماعی

رسم قیاسی کی تعریف یوں کی جاتی ہے:

"هو تصوير اللفظ بحروف هجائها علي تقدير الابتداء بها والوقف عليها."[3]

"یعنی حروف ہجاء سے مرکب الفاظ کی ایسی شکل جس سے ابتداء اور وقف کا اندازہ ہو سکے۔ اور رسم سماعی کی تعریف یوں کی جاتی ہے۔"

"الوضع الذي ارتضاه عثمان في كتابة كلمات القرآن وحروفه."[4]

کتابت کی وہ شکل جس کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآنی کلمات اور حروف لکھنے میں اختیار کیا۔ رسم عثمانی، رسم

---

1 لسان العرب ، بیروت : دار صادر ، (س ن)، مادہ"رسم " 12: 241
2 لطائف الاشارات لفنون القراءات
3 لطائف البیان فی رسم القرآن، شرح موردالظمان: ص: 14-15
4 مناهل العرقان فی علوم القرآن

اصطلاحی اور رسم توقیفی بھی کہا جاتا ہے۔[1] یہ تعریف جامع اور واضح ہے گو اور تعریفات بھی کی گئی ہیں۔[2] رسم عثمانی اور رسم سماعی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اول الذکر عام قواعد کتابت کے مطابق ہے۔ جبکہ رسم سماعی یا رسم عثمانی میں کچھ کلمات قواعد کے مخالف بھی لکھے گئے ہیں۔ اور یہ دو وجہ سے ہے۔

1. اختلاف قراءت کی حفاظت کے لیے، جیسے ﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ﴾[3] میں دال کے بعد الف پڑھا جاتا ہے جبکہ لکھی ہوئی واؤ ہے۔ عبداللہ ابن عامر شامی اس کو واؤ مفتوحہ سے پڑھتے ہیں "بِالْغَدٰو"۔[4]

2. کسی کلمے کی اصلیت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے جیسے الصلوۃ یا الزکوۃ میں واؤ کو الف کے ساتھ اس لئے لکھا گیا کہ معلوم ہو سکے کہ الف واؤ سے بدلا ہوا ہے یاء سے نہیں، یعنی اصل اس کلمہ کی واوی ہے یائی نہیں۔[5] اس طرح اہل لغت کے تلفظ کی طرف اشارہ کرنے کے لیے، جیسے "الربٰو" کی اہل حیرہ، جو قریش کے کتابت میں استاد تھے، ہونٹوں کو گول کرکے واؤ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے الف کو پڑھتے تھے۔ تو اس کلمہ میں اصل لغت کا لحاظ رکھتے ہوئے واؤ کے ساتھ لکھا گیا ہے، جبکہ قریش محض الف پڑھتے تھے۔[6] ایسے ہر سریانی زبان میں عموماً الف حذف کیا جاتا تھا، تو عربوں کے ہاں بھی اس کا رواج ہوا اور مصحف عثمانی میں بھی اس کا لحاظ رکھا گیا، جیسے الکتاب کو بغیر الف کے الکتب لکھتے ہیں۔[7]

عرب میں رسم الخط کا آغاز و ارتقاء

جزیرہ العرب کا مرکز مکہ مکرمہ، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ حضرت ہاجرہ اور ان کے فرزند حضرت

---

1 الفتح الربانی فی علاقه القراءات بالرسم العثمانی : ص: 20
2 دلیل الحیران شرح مورد الظمان فی علم رسم القرآن : ص: 40
3 سورة الانعام: 52
4 البدور الزاهرة فی القراءات العشر المتواترة : ص: 103
5 المقنع فی رسم مصاحف الامصار : ص : 77
6 مناهل العرقان : 1: 375
7 للمعة الشهية فی اللغة السريانية ، الموصل : 58

اسماعیل علیہ السلام کی ہجرت سے آباد ہوا۔ یہ پورا خطہ مجموعی طور پر تجارت پیشہ ہونے اور قوت حافظہ کی وجہ سے کتابت کا زیادہ محتاج نہ تھا، قرآن حکیم نے بھی اس کے رہنے والوں کو امیین سے تعبیر کیا ہے، ارشاد ہے:

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ﴾[1]

اور اس لقب کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا ذکر بھی کیا گیا:

﴿اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ﴾[2]

اور خود قرآن حکیم نے اس کی وجہ بھی بیان کر دی ہے کہ

﴿وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ﴾[3]

کہ باطل پرست اس کو ہاتھ کا لکھا ہوا گردانتے۔ لکھنے پڑھنے کے حوالہ سے قریش کی یہ عمومی صورتحال تھی، تاہم اس کے ساتھ ساتھ کچھ افراد یا ایک طبقہ ایسا تھا جو لکھنا جانتا تھا۔ چنانچہ اس بابت حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا کہ تم جاہلیت میں عربی کتابت کے ملا کر لکھنے اور الگ لکھنے کے طریقے جانتے تھے؟ تو انہوں نے فرمایا ہاں! سائل نے پوچھا تمھیں یہ کتابت کس نے سکھائی؟ فرمایا حرب بن امیہ بن عبد شمس (ابو سفیان رضی اللہ عنہ کے والد) نے۔ سائل نے پوچھا، ان کو کس نے کتابت سکھائی؟ فرمایا عبد اللہ بن جدعان (حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے چچازاد بھائی) اور بشر بن عبد الملک (عراق کے علاقے دومتہ الجندل کے حکمران، اکیدر بن عبد الملک کے بھائی) نے۔ چونکہ بشر کے حرب بن امیہ کے ساتھ انتہائی گہرے تجارتی تعلقات تھے، انہی تعلقات کے بنیاد پر حرب نے اپنی بیٹی صہباء (ابو سفیان رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ) کی شادی بشر سے کی تھی۔ چنانچہ حرب اور بشر نے عرب میں کتابت کو فروغ دیا۔ سائل نے مزید پوچھا کہ انہوں نے کتابت کہاں سے سیکھی؟ فرمایا: انبار (عراق کے مغرب میں معروف صوبائی دار الخلافہ جو اب بھی خوب آباد ہے۔ اس شہر کو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے 234ھ فاروقی دور

---

1 سورۃ الجمعۃ:2

2 سورۃ الاعراف:157

3 العنكبوت:48

میں فتح کیا تھا۔[1] والوں سے۔ سائل نے مزید پوچھا کہ اہل انبار نے کہاں سے سیکھی؟ فرمایا: خلجان بن موہم سے جو حضرت ہود علیہ السلام کے کاتب تھے۔[2] یہ تاریخ قریش عرب کی تھی۔ اسی طرح مدینہ منورہ میں یہودی علماء کے ہاں کتابت کا رواج تھا۔ ہجرت کے وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی عالم کو دیکھا وہ بچوں کو کتابت سکھا رہا تھا۔ جو لوگ کتابت میں شہرت رکھتے تھے ان میں منذر بن عمر رضی اللہ عنہ (منذر بن عمرو مشہور صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان ستر قراء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں، جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل نجد کی تربیت کیلئے بھیجا تھا اور تمام بئر معون میں شہید کر دیئے گئے تھے۔[3]، ابی بن کعب جیسے مشہور حضرات شامل ہیں۔ خود رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن ثابت کو سریانی زبان بولنے اور لکھنے کی تعلیم کیلئے بھیجا تھا۔[4] اس وقت یہ خط انباری حمیری (حمیر، عرب اور فارس کے درمیان مملکت جو 115 قبل مسیح وجود میں آئی، اور جس کے آخری بادشاہ یوسف ذونو اس نے یہودی مذہب اختیار کر کے عیسائیت پر انتہائی مظالم ڈھائے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے اہل حبشہ نے اس کو فتح کر لیا تھا۔[5] (اس کی طرف نسبت کی وجہ سے خط حمیری کہلاتا ہے۔) کہلاتا تھے۔ جب کوفہ تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں کا مرکز بنا تو علم فقہ، علم قراءت کی طرح علم رسم نے بھی تحسین کی منازل طے کیں۔

اموی خلیفہ عبد الملک بن مروان (م۔86ھ) نے خالد بن ابی الہیاج (م۔77ھ) (خالد بن ابی الھیاج، صدر اول کے عظیم الشان کاتب، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شاگرد (77ھ) میں فوت ہوئے۔[6] کو قرآن حکیم کے خوش خط نسخے تیار کرنے کا حکم دیا۔ کیونکہ خالد خط کے جمال میں مشہور ترین آدمی تھے۔ عباسی دور میں محمد بن مقلہ (ابن مقلہ، محمد بن علی بن حسین بن مقلہ، حسن کتابت میں ضرب المثل تھے۔ متعدد خلفاء کے ادوار میں زیادہ تر مالیانہ وصول کرنے کی ذمہ داری پر مامور تھے۔ عباسی خلیفہ راضی باللہ (329ھ) کے دور میں 328ھ کو فوت ہوئے۔[7] نے

---

1 الاستیعاب فی معرفة الاصحاب، مطبعة السعادة: 2: 11۔14
2 المحکم فی نقط المصاحف : ص: 22
3 الاصابة فی تمیز الصحابہ: 3: 123
4 جامع ترمذی: رقم الحدیث: 2639
5 المنتظم فی تاریخ الامم ادارة:1: 56
6 ابن الندیم محمد بن اسحاق ، الفہرست ، بیروت: دارالمعرفة ، 1978ء:1: 9
7 وفیات الاعیان انباء ابناء الزمان:5: 113

خط کوفی کو اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے بام عروج تک پہنچایا۔[1] چوتھی صدی کے اواخر تک قرآن حکیم خط کوفی میں لکھا جاتا رہا۔ البتہ پانچوں صدی میں خط کوفی کی جگہ خط نسخ نے لے لی، جس پر آج تک قرآن حکیم لکھا جارہا ہے۔[2]

نبی کریم ﷺ اور فن کتابت

یہ حقیقت مسلم ہے کہ نبی اکرم ﷺ شروع میں لکھنا اور پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ یہ نص قرآنی سے ثابت ہے، قرآن حکیم میں ہے:

﴿ وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ﴾[3]

البتہ یہ بات مختلف فیہ ہے کہ بعد میں رسول اللہ ﷺ نے لکھنا اور پڑھنا سیکھ لیا تھا یا نہیں؟ تعامل سے نہ کہ تلمذ سے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں نے معراج کی رات جنت کے دروازہ پر لکھا ہوا دیکھا کہ صدقہ کا ثواب دس گنا اور قرض دینے کا ثواب اٹھارہ گنا ہے۔[4] اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صلح حدیبیہ کی روایت نقل کی ہے جس میں ہے:

فأخذ رسول الله ﷺ الكتاب و ليس يحسن الكتاب ، فكتب هذا ما قاضي عليه محمد بن عبدالله"[5]

ایک موقعہ پر نبی کریم ﷺ نے حضرت معاویہ کو لکھنے کے متعلق ہدایات دیں:

"الق الدواة، حرف القلم ، وانصب الباء، فرق السين ، ولاتعور الميم ، وحسن الله، ومد الرحمن، جود الرحيم ، وضع قلمك على اذنك اليسرى،

1 ابن النديم ، الفهرست : ص: 6

2 مباحث فی علوم القرآن : ص: 99

3 العنكبوت : 48

4 سنن ابن ماجه : رقم الحديث: 2422

5 صحيح بخاری : رقم الحديث: 3920

فأنه اذكر لك ."[1]

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد اسکو راجح قرار دیا ہے۔[2]

علم الرسم کی اہمیت

عربی رسم الخط مختلف اعتبارات سے دوسرے کئی رسم الخط سے ممتاز ہے۔ عربوں کے ہاں قواعد رسم میں جو امور معروف تھے، ان کالحاظ تو رکھا ہی گیا ہے۔ تاہم اسکے ساتھ قرآن حکیم نے کچھ نئی مثالوں کا اضافہ بھی کیا ہے۔ جیسے حروف مقطعات کی کتابت۔ بظاہر ال م کو ملا کر پڑھنا چاہیے تھا مگر مقطعات میں تینوں کو قطع کر کے پڑھنے کا حکم دیا ہے اس انداز رسم کے کئی فوائد ہیں:

1. رسم کے اختلاف میں قراءات کی وجوہ کا لحاظ رکھا گیا ہے اس لئے کہ کبھی ایک رسم الخط دیگر قراءات کو شامل نہیں ہو سکتا۔ جیسے حذف واثبات، مثلا﴿وَ سَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾[3] کو مصحف مدنی اور شامی میں بغیر واو کے سارعو، جبکہ دیگر قراء کے ہاں واو کے ساتھ ہے۔ اور یہ دو قرأتیں ہیں۔[4] اور اس کا تعلق قرآنی خصوصیات کے ساتھ ہی ہے۔

2. عرب کے فصیح لہجات میں قرآن حکیم کے نازل ہونے کی تصدیق بھی رسم الخط سے ہوتی ہے۔ جیسے﴿قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰىنِ لَسٰحِرٰنِ﴾[5] مصاحف عثمانیہ چونکہ حرکات اور نقاط سے خالی تھے، اس لئے اس جملہ کے لکھنے کی صورت یہ تھی۔ ان ھدں لسحرں اس میں متعدد قراءات متواترہ ہیں۔ جن میں سوائے ایک کے سب پر یہ رسم منطبق ہے، اور وہ ایک صورت عام عرب لہجات کے برعکس بنو حارث بن کعب کے لہجے کو تسلیم کرنے سے ہی ممکن ہے جس کی تفصیل یہ ہے:

الف– ان ھذان: ان مشددہ کیساتھ ہذان منصوب بالالف۔ امام نافع، ابن عامر شامی، شعبہ، حمزہ وکسائی نے پڑھا

1　كنز العمال فى سنن الاقوال والافعال :10: 314

2　روح المعانى فى تفسير القرآن العظيم والسبع المثانى : 4: 21

3　سورة آل عمران : 133

4　املاء مامن به الرحمن فى وجوه الاعراب والقراءات فى جميع القرآن :ص: 149

5　طه:63

ہے۔[1] اور یہ جمہور کے قواعد نحویہ کے خلاف ہے۔ لیکن قراءات، جن کا تعلق سماع سے ہے، کے مقابلے میں قواعد نحویہ کوئی معنی نہیں رکھتے۔ مشہور یہی ہے کہ اِنَّ مشبہ بالفعل کا اسم اگر تثنیہ ہو، تو منصوب بالیاء ہوتا ہے۔[2] جبکہ یہاں الف کے ساتھ ہے۔ اسی لیے ائمہ لغت نے اس کی وضاحت کر دی ہے کہ یہ بنو حارث بن کعب کا لہجہ ہے۔ وہ الف تثنیہ کو مرفوع، منصوب، مجرور تینوں صورتوں میں باقی رکھتے ہیں۔[3] اس بناء پر وہ (جَاءَ الرَّجُلَانِ۔ رَأَيْتُ الرَّجُلَانِ۔ مَرَرْتَ بِالرَّجُلَانِ) بولتے ہیں۔ اور اسکے شواہد بھی موجود ہیں۔ جیسا کہ شعر ہے:

تزود منا بين أذناه طعنة دعته إلى هابي التراب عقيم [4]

اَذناہ مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے عام نحویوں کے قاعدہ کے مطابق یاء کے ساتھ ہوتا، لیکن شاعر نے بنو حارث بن کعب کی نمائندگی کی ہے۔ اور "اذناہ" کو الف کے ساتھ پڑھا ہے۔ رہا یہ کہ اس صورت میں رسم کا انطباق کیسے ہو گا کہ رسم یاء کے ساتھ ہے؟ تو ایک ایسا مشہور مسئلہ ہے جو عربی رسم الخط میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ جیسے ذکرٰھا، مجرٰھا، تقوٰھا وغیرہ یہ تمام کلمات لکھے یاء سے جاتے ہیں۔ جبکہ ان سب میں پڑھا الف جاتا ہے۔ اسی طرح ہذین میں الف یاء سے بدلا ہوا پڑھا جاتا ہے۔

3. دورانِ تلاوت وقف غلط ہونے سے بسا اوقات معانی بھی بدل جاتے ہیں۔ صحیح وقف اور غلط وقف میں رسم کا بہت زیادہ دخل ہے۔ مثلا تاء تانیث رسم قرآنی میں کئی ایک جگہ تاء طویلہ کی صورت لکھی گئی ہے۔ اور بعض دوسری جگہوں میں گول تاء کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ جہاں تاء طویلہ ہے وہاں وقف تاء کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور جہاں گول تاء ہو وہاں وقف ھاء کے ساتھ ہو گا۔ اور اس کو وقف بالابدال کہتے ہیں: ﴿ اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَ الْعُزّٰى ﴾[5] میں تاء طویلہ کے ساتھ وقف کیا جاتا ہے۔ اگر گول تاء ہوتی اور اس کا وقف ھاء سے کیا جاتا، تو یہ اللاہ بن جاتا، جو نطق میں اسم اللہ کے ساتھ ملتبس ہو جاتا۔ اس حکمت کے پیش نظر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن حکیم

1 تقريب النشر فى القراءات العشر :ص: 299
2 هداية النحو : ص: 15
3 الكشف عن وجه القراءات وعللها وحججها
4 جمهرة اللغة
5 سورة النجم :19

جمع کرنے والی کمیٹی سے فرمایا تھا" اذا اختلفتم أنتم وزید في شئ من القرآن فاکتبوہ بلسان قریش "[1] تو"التابوت" میں اختلاف ہوا، جس کا حل قریش کے لہجہ سے کیا گیا کہ وہ وقف میں التابوت کہتے ہیں التابوہ نہیں کہتے۔ لہٰذا اس کلمے کو لمبی تاء کے ساتھ لکھا دیا گیا۔[2]

4. ایک ہی کلمہ قرآن حکیم میں ایک جگہ مقطوع لکھا گیا ہے۔ جیسے ﴿فَمَنۡ یُّجَادِلُ اللّٰہَ عَنۡہُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ اَمۡ مَّنۡ یَّکُوۡنُ عَلَیۡہِمۡ وَکِیۡلًا﴾[3] اس آیت میں ام کو من سے کاٹ کر لکھا گیا ہے، جبکہ یہی کلمہ ﴿اَمَّنۡ یَّمۡشِیۡ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ﴾[4] میں موصول لکھا گیا ہے۔ یعنی ایک ہی میم مشدد لکھی گئی ہے۔ اس مقطوع اور موصول میں یہ معلوم ہوتا ہے ام الگ لکھا ہو، تو وہ بل کے معنی میں ہو کر اضراب (اضراب کا معنی ہے: الاعراض عن الاخبار الاول والاستیناف بسوال آخر یعنی پہلی بات سے اعراض کرتے ہوئے دوسری بات کو ثابت کرنا: ھدایۃ النحو کا فائدہ دیتا ہے۔ جبکہ ایک ہی میم مشدد ہو تو وہ ادغام میں تاکید کا فائدہ دیتا ہے۔ المقنع

5. مصاحف عثمانیہ لکھتے وقت حرکات اور نقاط نہیں تھے۔ جب کبھی حرکت کے اظہار کی ضرورت ہوتی، تو ایسے مواقع میں حرکت کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے متعلقہ حرف لکھ کر حرکت کی طرف اشارہ کر دیا جاتا۔ جیسے ﴿اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَ الۡاِحۡسَانِ وَ اِیۡتَآیِٔ ذِی الۡقُرۡبٰی﴾[5] میں ہمزہ کی حرکت معلوم نہ ہونے اور التباس پیدا ہونے کی وجہ سے کسرہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری تھا، تو ﴿وَ اِیۡتَآیِٔ﴾ میں ہمزہ بصورت یاء لکھ دیا، تا کہ کسرہ کی طرف اشارہ ہو۔ اسی طرح ﴿سَاُورِیۡکُمۡ دَارَ الۡفٰسِقِیۡنَ﴾[6] میں ہمزہ کے ضمہ کو واو کے ساتھ ظاہر کر کے سَأُورِیۡکُمۡ لکھا گیا ہے۔[7]

---

1 صحيح بخاری: رقم الحديث: 3244
2 تاريخ المصحف الشريف
3 سورة النساء: 109
4 سورة الملك: 22
5 سورة النحل: 90
6 سورة الاعراف: 145
7 المقنع : ص: 77

6. رسم قرآنی کی وجہ سے کئی دفعہ کسی کلمے کے اشتقاق معلوم کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ جیسے الصلوۃ اور الزکوۃ میں الف کو واو کی صورت میں لکھا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ الف واوی ہے یائی نہیں ہے۔ لہٰذا جمع معلوم کرنے میں آسانی ہوگئی کہ ان کی جمع صلوات اور زکوات آتی ہے، صلیات اور زکیات نہیں آتی ہے۔[1]

7. کبھی رسم کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی قوت کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ جیسے ﴿وَ السَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ﴾[2] ایید کو دو یاء کے ساتھ لکھا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ آسمان پیدا کرنے والے کی قوت تمام قوتوں پر فائق ہے۔[3]

8. رسم قرآنی کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ لوگ از خود قرآن حکیم کی درست تلاوت نہیں کرسکتے۔ جب تک قرآن حکیم کے ماہر سے پڑھ نہ لیں۔ اور یہ شان معلم، سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کو عطاء کی گئی۔ آپ ﷺ کے تربیت کرنے کے شعبہ جات میں سے ایک شعبہ، تلاوت آیات کا بھی تھا۔ اس سے قرآن حکیم کی عظمت انسانی دلوں میں جاگزیں ہوتی ہے، اور پڑھانے والے کا احترام طبیعت میں پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کا واضح اظہار حروف مقطعات میں ہوتا ہے، جیسے کھیعص اور عسق اور طسم بغیر استاد کے پڑھائے، از خود نہیں پڑھے جاسکتے۔[4]

9. جب یہ کلمات قرآنیہ بغیر کسی معلم کے نہیں پڑھے جاسکتے، تو امم سابقہ کے ہاں جو تحریف لفظی ہوئی ہے، انتہائی اہتمام کی وجہ سے قرآن حکیم کی تحریف لفظی کا امکان باقی نہ رہا۔[5]

10. اس رسم الخط کی وجہ سے سلسلہ بسلسلہ سند رسول اللہ ﷺ تک پہنچتی ہے۔ اور یہ اس امت کی اہم خصوصیات میں سے ہے۔ المقنع یہ چند فوائد اور حکمتیں ہے جو علم الرسم القرآنی میں پنہاں ہیں۔

رسم عثمانی کے التزام کا حکم

جب یہ بات ثابت ہو چکی، کہ رسم قرآنی دو قسم کا ہے، ایک وہ جو عام قواعد کتابت کے موافق ہے۔ اور اس کی

---

1 ایضاً

2 الذاریات :47؛مناهل العرفان :1: 263

3 ایضاً: 1: 264۔265

4 دليل الحيران شرح مورد الظمان فی علم رسم القرآن

5 مناهل العرفان : 1: 265

قراءت بھی ظاہری کتابت کے مطابق ہے۔اس کتابت کی پابندی کرنے میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے۔البتہ جو کلمات، عام عربی قواعد کتابت کے مخالف ہیں، تو ان کے لکھنے میں رسم عثمانی کی پابندی لازم ہے، یا عام قواعد کتابت کے مطابق لکھا جا سکتا ہے۔اس سلسلے میں ائمہ فن کے ہاں مختلف آراء ہیں۔

1. پہلی رائے یہ ہے کہ رسم عثمانی توقیفی ہے۔اس کے خلاف کوئی بھی جملہ لکھنا درست نہیں۔یہ رائے متقدمین کے ہاں اکثر اور متاخرین کے ہاں کم ملتی ہے، جن میں مشہور ترین امام مالک بن انس، یحییٰ نیساپوری، امام احمد بن حنبل، ابو عمر دانی، علی بن محمد سخاوی، احمد بن حسین البیہقی رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ رسم عثمانی کی مخالفت جائز ہے یا نہیں؟ تو فرمایا میں اس کو جائز نہیں سمجھتا۔بلکہ قرآن حکیم اولین کتابت پر ہی لکھا جائے۔[1] اس پر علامہ دانی رحمۃ اللہ علیہ تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی اس رائے کا کوئی بھی مخالف نہیں ہے۔[2] امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ واو، الف اور یاء میں مصاحف عثمانیہ کے خلاف لکھنا حرام ہے۔[3] ان حضرات کے دلائل یہ ہیں:

الف: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کو املاء خود کروائی ہے، کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تصحیح بھی کی ہے۔اور حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو قلم کے استعمال کے درست طریقے بھی بتائے ہیں۔[4] اگر اس کی اہمیت نہ ہوتی تو حضور اتنا اہتمام نہ فرماتے:

ب: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رسم کے مطابق ہی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے قرآن حکیم کو جمع کیا۔

ج: سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے جو کمیٹی تشکیل دی، اس میں مصحف صدیقی کی رسم کی مخالفت نہیں کی۔اور اسی پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہو چکا ہے۔امام احمد بن حسین البیہقی رحمۃ اللہ علیہ شعب الایمان میں فرماتے ہیں جو شخص قرآن شریف لکھے، مناسب ہے کہ اسی ھجاء کی پابندی کرے، جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم لکھ چکے ہیں۔کسی بات میں ان کے مخالفت نہ کرے۔وہ ہم سے علم میں زیادہ تھے، قلب ولسان کے ہم سے زیادہ صادق تھے، اور امانت میں عظیم

---

1 ایضاء ص: 10

2 البرهان فی علوم القرآن :1: 379

3 کتاب 'الکُتَّاب '

4 شعب الإيمان، باب:تعلموا العربية وتفقهوا : 6: 206

الشان تھے۔ لہٰذا ہمیں حق نہیں پہنچتا کہ ہم اپنے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہو کر ان پر کوئی حکم لگائیں۔[1]

2. دوسری رائے مذکورہ بالا رائے کے بالکل عکس ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ رسم عثمانی بے شک پہلی کتابت پر اتفاقاً قائم رہا، لیکن اس کی تمام اوضاع کاتبین وحی کی اپنی اختیار کردہ ہیں۔ دور نبوی ﷺ میں مختلف اوقات میں مختلف کاتبین نے وحی کو لکھا، جن کی تعداد تقریباً چالیس ہے، اسی رسم پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں اتباع کی گئی، لیکن اس کو توقیفی یا سماعی نہیں کہہ سکتے۔ یہ رائے الباقلانی اور ابن خلدون کی ہے۔ الباقلانی فرماتے ہیں: ”کتابت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ بھی واجب نہیں۔“ کیونکہ کاتبین قرآن اور خطاطین مصاحف پر من جانب اللہ کسی بھی رسم کو معین نہیں کیا گیا، کہ اسی کی پابندی کی جائے، اور دیگر کوئی رسم اختیار نہ کی جائے، وجوب کے لیے سماع اور توقف کا پایا جانا ضروری ہے۔ جو کتاب وسنت سے نصاً یا مفہوماً ثابت نہیں، بلکہ اجماع امت سے بھی کوئی واجب قرار دینے والی ہدایت نہیں ملتی۔ البتہ اس کے برعکس سنت رسول اللہ ﷺ وحی لکھنے کا حکم فرماتے، لیکن کسی معین صورت پر لکھنے کی ہدایت نہیں فرماتے تھے۔ اور نہ کسی طریقہ پر لکھنے سے منع فرماتے ہیں۔ المقدمہ اس سے ثابت ہوا کہ جو جہاں رواج ہو، اور آسان و مشہور ہو، وہی رسم اختیار کر لینا جائز ہے۔ ایسا کرنا نہ گناہ ہے نہ بدعت ہے اور یہی رائے ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ البرھان: 1/379 اس رائے کی روشنی میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ کاتبین مصحف کو رسم مصحف میں مکمل آزادی ہے، حالات کے مطابق جیسے چاہیں لکھیں۔

3. تیسری رائے اس سلسلے میں اعتدال پر مبنی ہے اور فریقین کے درمیان فیصلہ کر دینے والی ہے، اور وہ یہ ہے کہ عوام الناس کے لیے تو مروجہ قوانین کتابت کے مطابق قرآن حکیم کی کتابت کرنی چاہیے، لیکن رسم عثمانی کی اصل کے بقاء کی خاطر خواص یعنی علماء و قراء کیلئے رسم عثمانی کی ہی پابندی کرنی چاہیے۔ گویا جواز طرفین کا موجود ہے۔ البتہ اسلاف کی روایات کا ضیاع، قوموں کے ہاں معیوب سمجھا جاتا ہے۔ یہ رائے امام زرکشی رحمۃ اللہ علیہ (عزالدین، قاضی، دمشق کے مشہور خطیب، مفتی، صلیبی جنگوں میں اور تاتار کے فتنوں کے خلاف نمایاں کردار رہا، 660ھ میں فوت ہوئے۔[2] طبقات الشافعیۃ: 5/80-107 اور عزبن عبدالسلام، مناھل العرفان: 1/385 کی ہے۔

---

1 اعجاز القرآن منشاۃ المعارف

2 اعجاز القرآن منشاۃ المعارف

عقيلة اتراب القصائد فی آسنی المقاصد: ص 121 ان تین آراء کا موازنہ کیا جائے تو پہلی رائے بے لچک معلوم ہوتی ہے اور یہ رائے ایسی ہی ہے جیسے ایک دور میں علم الکلام کو غلط اور مردود کہا جارہا تھا، چونکہ وہ پہلے دور کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن بعد میں اس کی حقیقت مسلم ہوگئی۔

جہاں تک دوسری رائے کا تعلق ہے اور وہ رائے باقلانی اور ابن خلدون کی ہے، تو اگر اس سے مراد یہ ہے کہ رسم خط میں قراءات کالحاظ رکھے بغیر بھی تبدیلی کی جاسکتی ہے، تو یہ درست نہ ہوگا، کہ قراءات کی صحت پر امت کا اجماع ہو چکا ہے۔ اور مصاحف عثمانیہ میں سے کسی ایک کی موافقت اس کی صحت کی علامت ہے جیسا کہ شركائهم مرفوع ہو تو ہمزہ بصورت واؤ لکھا جاتا ہے۔ اور اگر مجرور ہو تو شركائهم بصورت یاء لکھا جاتا ہے۔ چونکہ دوسری قراءت امام عبداللہ بن عامر شامی کی ہے۔ جن کے ہاں آیت اس طرح ہے۔ وكذلك زين ماضی مجہول کے ساتھ لكثير من المشركين قتل مرفوع بنابر فاعلیت أولادهم منصوب بنابر مفعولیت برائے مصدر شركائهم مضاف الیہ، جبکہ دیگر تمام قراءنے اس کو شركاؤهم مرفوع پڑھا ہے۔ امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"لدار شام وقل أولادهم شركائهم بياء به مرسومه نصرا."[1]

قاری نذر محمد رحمۃ اللہ علیہ

"وكذلك زين لكثير من المشركين قتل أولادهم شركاؤهم في المصحف الشامي زين بصيغة الماضي المجهول وقتل برفع اللام و أولادهم بأنصب وشركائهم بالخفض والهمزة بصورة الياء "[2]

اس صورت میں تو رسم مصحف کی اتباع لازم ہے اور اگر رسم عثمانی کی تحسین اور تسہیل کا مسئلہ ہو تو دوسری رائے کو بھی لیا جاسکتا ہے۔[3]

---

1 تسهيل البيان فی رسم خط القرآن: ص: 162

2 رسم المصحف: 189۔190

3 الجامع الصحيح باب كيف كان بدء الوحی إلى رسول الله ﷺ: 3

کتابت مصاحف کا پہلا دور

قرآن حکیم کے الفاظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہیں اور اس کا نزول 23 سال کے عرصے میں مکمل ہوا۔یہی وجہ ہے کہ حیات طیبہ میں قرآن حکیم کی ایک مصحف میں تدوین ممکن نہیں ہوسکی۔مزید برآں یہ کہ مختلف اوقات میں متعدد وفود اور افراد آتے۔ نبی کریم ﷺ ان کو قرآن حکیم بمع تفسیر سکھاتے، اور وہ دور دراز اپنے علاقوں میں جاکر یہ سلسلہ جاری رکھتے۔ اسی طرح قرآن حکیم جزوی طور پر یعنی ایک سورت دو سورتیں، یا چند آیات ان کے پاس لکھی ہوتیں، اور اس میں تفسیری جملے بھی ہوتے تو اس طرح مکمل ہونے سے پہلے ایک کتابی شکل میں جمع کرنا ممکن نہ تھا۔ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن حکیم کی ترتیب جو لوح محفوظ میں ہے وہ اور ہے، او رترتیب نزولی اور ہے۔ چنانچہ ترتیب نزولی میں سب سے پہلے سورۃ العلق کی آیات ہیں مناھل العرفان:1/93 اور سب سے آخری آیت ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ﴾[1] ہے۔[2] لہٰذا بغیر مکمل ہوئے ایک کتابی شکل میں تدوین ممکن نہ تھی۔ ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ نزول قرآن کے وقت عربوں کے ہاں خصوصا کاغذ کی کمی کا مسئلہ درپیش تھا۔یہی وجہ ہے کہ وہ اونٹ کی کھال، کھجور کے چھال، شانہ کی ہڈی اور پتھر کے تراشوں پر لکھتے تھے۔[3] اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ کتابت جاننے والے لوگ بھی کم تھے۔ اس لئے فوری طور پر مکمل قرآن حکیم مدون کرنا ممکن نہ تھا۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ حضور ﷺ نے آخر میں کیوں مدون نہ کیا؟ تو درحقیقت آپ ﷺ آخری آیت کے نزول کے صرف 9 دن بعد دنیا میں تشریف فرما رہے۔ اور پھر اس دار فانی سے دار بقاء کی طرف تشریف لے گئے۔ اس قلیل مدت میں تدوین ممکن نہ تھی۔ تاہم جس قدر نزول ہوتا تھا رسول اللہ ﷺ کاتبین کو بلا کر لکھواتے تھے۔ جن میں سیدنا ابوبکر صدیق، حضرت علی بن ابی طالب، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابی بن کعب، حضرت زبیر بن عوام ، حضرت ارقم بن ابی الارقم ، حضرت مغیرہ بن شعبہ ، حضرت معاویہ بن ابی

---

1 سورة البقرة :281

2 المستدرك على الصحيحين :2: 229

3 تاريخ دمشق : 331۔346

سفیان رضی اللہ عنہم مشہور تھے۔[1] اس کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے طور پر جو کچھ سنا، ولکھ لیا۔ ایسے مصاحف جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے لئے لکھے تھے، یقینی بات ہے کہ وہ بھی پورے نہ تھے۔ کیوں کہ وہ دور دراز سفر میں بھی گئے، اور مستقل بعض علاقوں میں کام کرنے بھی گئے۔ ان مصاحف میں سے چند مشہور یہ ہیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مصحف — حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مصحف

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مصحف — حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا مصحف

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا مصحف — حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا مصحف

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا مصحف — حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا مصحف

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا مصحف — حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ کا مصحف

کتاب المصاحف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مصاحف صحابہ کے شاگردوں نے از خود مرتب کئے تھے۔ اور یہ مصاحف مکمل نہیں تھے۔ نیز ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تفسیری جملے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فقہی استنباط بھی شامل تھے۔ یہ کتابت قرآن کا پہلا دور تھا۔

دوسرا دور

جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دور آیا اور دیگر معرکوں کی بنسبت سخت معرکہ، یمامہ میں پیش آیا۔ جس میں مد مقابل جھوٹے نبوت کے دعویدار تھے، اور جن کا راہنما مسیلمہ کذاب تھا، اس میں سینکڑوں صحابہ شہید ہوئے، جن میں ستر قراء صحابہ تھے۔ اس سے یہ خدشہ ہوا کہ اگر قراء صحابہ کا قتل ایسے ہی جاری رہا، تو قرآن حکیم ضائع ہو جائے گا۔ جبکہ مکمل قرآن حکیم کا خالص متن مدون شکل میں موجود نہ تھا۔ خلیفۃ المسلمین حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو سب سے پہلے اس کی طرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے متوجہ کیا۔ باہمی مشورہ سے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی، جس کیلئے سربراہ کے طور پر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا انتخاب کیا گیا، ان کے انتخاب کی وجوہات درج ذیل ہیں:

☆ حافظ بے مثال تھا۔ ☆ کسی تحریف کے حوالے سے با اعتماد تھے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آخری رمضان میں جبرائیل امین کے چار ختموں میں شریک تھے۔ لہٰذا وہ مکمل طور پر جانتے تھے

---

1 المصاحف :1: 373۔380

کہ قرآن حکیم کا اول اور آخر کیا ہے؟ متن قرآن کیا ہے؟ اور تفسیری جملے کیا کیا ہیں وغیرہ، جمع قرآن کے حوالہ سے جن اہم نقاط کا تعین کیا گیا وہ جو اس کی خصوصیات ہیں وہ یہ ہیں۔

عام اعلان کیا گیا کہ جن لوگوں کے پاس قرآن حکیم کی کوئی آیت لکھی ہوئی ہو اور اس نے وہ آیت رسول اللہ ﷺ کے سامنے لکھی ہو، وہ لیکر آئے۔

اسکے ساتھ دو عدل ضابط گواہ ہوں جو اس بات کی شہادت دیں کہ واقعی یہ آیت حضور کے سامنے لکھی گئی ہے۔

مسجد نبوی ﷺ کے دروازہ پر دو چوکیدار کھڑے کر دیئے گئے جو آیت کی تحریر اور گواہوں کی موجودگی کو چیک کر کے مسجد میں داخلہ کی اجازت دیں۔

لکھنے والی کمیٹی جو حفاظ کرام پر مشتمل تھی، وہ اپنی یاد کی ہوئی آیت کے ساتھ لکھی ہوئی آیت کا موازنہ کریں کہ واقعی یہ آیت قرآن حکیم کی ہے۔ اس احتیاط کے ساتھ قرآن حکیم کو جمع کر کے ایک مصحف کی صورت میں مدون کر دیا گیا۔[1]

یہ مصحف خلیفہ اول کے پاس رہا، اس کے بعد خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس رہا۔ ان کی شہادت کے بعد ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس رہا۔ اس دوران نامور قراء کرام کی موجودگی کی وجہ سے اس بات کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ اس کی مزید کاپیاں لکھوا کر مختلف شہروں کو ارسال کی جائیں۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے انفرادی مصاحف، جن میں تفسیری نکات اور متن کا امتیاز مشکل تھا، ان پر تلاوت کرنے کو ممنوع قرار دیا جائے۔ یہ مصحف صدیقی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی وفات تک ان کے پاس ہی رہا۔ وفات کے بعد مروان بن حکم نے اپنے پاس منگوا کے جلا دیا (آرمینیا وسطی ایشیاء کی مشہور ریاست ایران کی حدود کے ساتھ متصل، دجلہ و فرات کا منبع ہے۔ آذربائیجان بھی سابقہ سودیت یونین کی مشہور ریاست، بحر قزوین پر واقع ایران کی حدود کے ساتھ متصل، پٹرول کا خزانہ، قوقاز کے پہاڑوں سے ڈھانپا ہوا علاقہ ہے۔[2] یہ جمع قرآن کا دوسرا دور تھا اور اس کا سبب قراء صحابہ کی شہادت اور قرآن حکیم کے ضیاع کا خدشہ تھا۔

---

1 فضائل القرآن :ص: 19

2 المنجد فی الاعلام کر م بستانی : 39-33

تیسرا دور

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ منتخب ہوئے، تو ساری مملکت میں امن عام تھا، لیکن 25ھ میں جب آرمینیا اور آذربیجان (حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے راز دان صحابی ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دور میں 36ھ وفات پائی۔[1] میں بغاوت پھیلی تو شام اور عراق کی فوجیں اس طرف بھیج دی گئیں اس دوران تلاوت کرتے ہوئے اہل عراق کی تلاوت اور شامیوں کی تلاوت میں فرق پایا گیا جس نے فوج کے عمومی چند لوگوں میں اختلاف کی کیفیت پیدا کر دی اور یہ اختلاف اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ (عبد اللہ بن زبیر بن عوام، ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں مہاجرین کے ہاں سب سے پہلے نومولود (73ھ) کو شہید ہوئے۔[2] کے خیال کے مطابق جنگ کا خطرہ تھا، تو انہوں نے امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع دی اور فرمایا: "أدرك هذه الأمة قبل أن يختلفوا في الكتاب اختلاف اليهود والنصاري" یہود و نصاریٰ کی طرح کتاب اللہ میں جھگڑنے سے پہلے اس امت کا نوٹس لیجئے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو پیغام بھیجا کہ مصحف صدیقی ہمیں دیجئے اور ایک کمیٹی تشکیل دی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں اس کے دیگر ارکان عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ (سعید بن العاص بن سعید بن العاص، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت 9 سال عمر تھی۔ 58ھ کو فوت ہوئے۔[3]) سعید بن العاص رضی اللہ عنہ (عبد الرحمن بن حارث بن ہشام مخزومی، کبار تابعین میں سے ہیں، 43ھ کو فوت ہوئے۔[4] عبد الرحمن بن حارث رضی اللہ عنہ) مذکورہ چار افراد کی معاونت کرنے والے افراد کے نام یہ ہیں:

1۔ مالک بن ابی عامر 2۔ کثیر ابن افلح 3۔ عبد اللہ بن عمر بن العاص 4۔ عبد اللہ بن عباس
5۔ عبد اللہ بن عمر بن الخطاب 6۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہم[5] نے اپنا کام شروع کیا۔ یہ مستقل کمیٹی تھی جس

---

1 ابن حجر، الاصابة : 1: 317

2 تقريب التهذيب :1: 303

3 تقريب التهذيب : 1: 273

4 تقريب التهذيب : 1: 338

5 الكواكب الدرية فيما يتعلق بالمصاحف العثمانية ص: 29

کے چاروں ارکان ضبط قرآن اور کتابت میں شہرت رکھتے تھے۔ دیگر ارکان (ایک قول میں پانچ تھے اور ایک میں آٹھ تھے۔ ان اقوال میں تطبیق یہ دی جاتی ہے کہ جنھوں نے پانچ بتائے وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ارسال کردہ مصاحف کو شمار کرتے ہیں، امیر المؤمنین کے ذاتی مصحف کو شمار نہیں کرتے۔ اسے شمار کرنے والوں نے چھ بتائے دوسرے مرحلے میں یمن اور بحرین کو بھی بھیجے گئے۔ ان کو ملا کر آٹھ کا قول بھی ملتا ہے۔ اسی لئے راجح یہی ہے کہ پہلے چھ مصاحف لکھوائے گئے تھے۔ دیکھئے: المقنع: ص12 وقتاً فوقتاً ان کی معاونت کرتے تھے۔ حضرت حفصہ کے ہاں سے حاصل کئے ہوئے مصحف صدیقی کے مشہور قول کے مطابق چھ نسخے[1] تیار کئے اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو ان کا مصحف صدیقی واپس کردیا۔

مصاحف عثمانیہ کی خصوصیات

امیر المومنین نے مصحف صدیقی سے متعدد نسخے تیار کروائے۔ لہذا بنیادی طور پر رسم صدیقی اور رسم عثمانی میں کوئی فرق نہ تھا۔ اور یہ وہی رسم ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں معروف تھی۔[2] البتہ چند وہ کلمات، جن کا تعلق حذف واضافہ کے ساتھ تھا، یا ایک رسم پر متعدد قراءات منطبق نہیں ہو سکتی تھیں، ان میں یہ ہدایت کی گئی کہ کسی مصحف میں ایک رسم اور دوسرے میں دوسری رسم کے ساتھ لکھا جائے۔ اور یہ کل 41 جگہ ہیں۔ اس کے ساتھ اس کمیٹی کو یہ حکم بھی دیا گیا کہ جہاں کہیں تمھارا باہمی اختلاف آجائے، تو قریش کی ادائیگی کی بنیاد پر رسم کو ترجیح دی جائے اور وہ اختلاف ایک ہی جگہ تھا یعنی التابوت میں کہ یہ گول تاء کے ساتھ ہو یا لمبی تاء سے، تو قریش کے تاء کے ساتھ وقف کو سامنے رکھتے ہوئے لمبی تاء کے ساتھ لکھا گیا۔ یہ جمع قرآن کا تیسرا دور تھا، اور اس کا بنیادی سبب عوام الناس کے مختلف قراءات شاذہ یعنی تفسیرات نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور تفسیرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے خلط ملط ہونے کی وجہ سے اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ اب وقت آ گیا تھا کہ یہ مشکلات پیدا کرنے والے مصاحف کو جمع کر کے جلا دیا جائے۔ اور مرکزی مصاحف کو رائج کر دیا جائے۔ جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کیا۔ اس جمع عثمانی میں رسم قرآن کا خصوصی اہتمام کیا گیا، اور درج ذیل امور کا لحاظ رکھا گیا۔

---

1 تسهيل البيان : ص: 40۔41

2 المعجزة الكبرى :ص: 29

1. جہاں ایک رسم پر متعدد قراءات منطبق نہیں ہو سکتی تھیں وہاں رسم کو متعدد مصاحف پر تقسیم کر دیا گیا۔ مثلاً ایک مصحف میں حذف دوسرے میں اثبات وغیرہ۔

2. یہ مصاحف مختلف شہروں کو بھیجے، اور ان کے مطابق تلاوت کرنے کا حکم جاری کیا گیا۔

3. مصاحف کے ارسال پر ہی اکتفاء نہیں کیا گیا بلکہ ہر مصحف کے ساتھ ایک ماہر قاری بھی بھیجا، کہ وہ ان کو درست قرآن حکیم پڑھائے۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابت ؓ مدینہ کے قاری مقرر ہوئے۔ اور عامر بن عبد قیس کو مصحف بصری کے ساتھ بھیجا گیا۔ مصحف مکی کے ساتھ عبداللہ بن السائب مخزومی اور مصحف کوفی کے ساتھ ابو عبدالرحمن سلمی نیز مصحف شامی کے ساتھ مغیرہ بن شہاب کو بھیجا گیا اور ایک مصحف امیر المومنین نے اپنی تلاوت کیلئے رکھا۔

4. حضرت عثمان ؓ نے جمع کے وقت تاکید کی کہ ہر آیت کو لکھنے سے پہلے تسلی کر لیں کہ یہ قرآن ہے، تفسیر یا استنباط تو نہیں ہے؟

5. یہ حکم جاری کیا گیا کہ کوئی آیت اس وقت تک نہ لکھی جائے، جب تک کمیٹی کے ماہرین سے تصدیق نہ کروالی جائے۔[1] یہ وہ عثمانی کارنامہ ہے جس نے قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے قرآن حکیم پر اختلاف کو ختم کر دیا۔ اسی لئے حضرت علی ؓ فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں عثمان کی جگہ پر ہوتا تو وہی کرتا جو انہوں نے کیا۔ اس لئے عثمان کے بارے میں حسن ظن رکھو۔[2]

قرآنی رسم الخط میں نقاط اور حرکات کی ابتداء

قرآن حکیم خالص عربی میں نازل ہوا اور اس کے مخاطبین فصحائے عرب تھے، جنہیں کسی حرکت اور نقطے کی ضرورت نہ تھی۔ بلا اعراب تلاوت کرنا ان کا فطری خاصا تھا۔ اس لئے حضرت عثمان ؓ نے رسم قرآنی کو اعراب اور نقاط سے خالی رکھا۔ جس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ جہاں قراءات کا اختلاف اعراب یا نقطوں کا ہے، وہاں ایک ہی رسم تمام قراءات پر منطبق ہو گئی۔ جب اسلام اپنے سماجی اور سیاسی و معاشی عدل پر مبنی رویوں اور

---

1 السنن الکبریٰ: 2: 42

2 روح المعانی: 7: 153

ضابطوں کے ساتھ غیر عرب میں متعارف ہوا اور وہ جوق در جوق اس کے نظام کو قبول کرنے لگے، تو قرآن حکیم جو اس نظام کی اساس ہے، کی تعلیم میں دقت پیش آنے لگی، اور لوگ غیر ارادی طور پر غلط پڑھنے لگے، جس سے معانی و مفاہیم بدل رہے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں آپ کو اطلاع ہوئی کہ ایک دیہاتی کو اس کے استاد نے یہ آیت اس طرح پڑھائی:

﴿ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيۡٓءٌ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۙ وَرَسُوۡلِهٖ ﴾ حرکت کسرہ کے ساتھ، جس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ مشرکین اور رسول سے بھی بیزار ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ دیہاتی کہتا ہے جب اللہ اپنے رسول سے بیزار ہے تو میں بھی اس سے بیزار ہوں (معاذ اللہ)، جس کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نوٹس لیا اور لوگوں کو عربی سیکھنے کا حکم دیا۔ دوبارہ ابو الاسود رحمۃ اللہ علیہ نے یہی جملہ کسی دیہاتی سے سنا، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع دی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قواعد نحو وضع کرو۔ پھر اموی دور میں ابو الاسود نے دس افراد کو منتخب کر کے آیات قرآنیہ پر اعراب لگانے کا کام شروع کیا، جن میں سے مشہور ترین یحییٰ بن یعمر اور حسن یسار بصری ہیں۔ یحییٰ بن یعمر، ابو الاسود کے شاگرد خاص بھی ہیں۔ یہ سارا عمل اموی خلیفہ عبد الملک بن مروان کے حکم سے ہوا۔ خلیفہ نے اس کام کی کل وقتی نگرانی کیلئے حجاج بن یوسف کو یہ جدوجہد سونپی، جو اس نے انتہائی احسن انداز سے مکمل کی۔ ابتدائی مرحلے میں یہ طریقہ کار اختیار کیا گیا، کہ آیات قرآنیہ کی کتابت جس رنگ سے ہوئی، اس کے علاوہ کسی دوسرے رنگ سے حروف پر نقطے لگائے گئے۔ فتحہ کیلئے حرف پر ایک نقطہ، کسرہ کیلئے حرف کے نیچے اور تنوین کیلئے دو نقطے مقرر کئے۔ ضمہ کیلئے حرف کے سامنے ایک نقطہ مقرر ہوا۔ کچھ عرصہ تک یہ اصطلاحات اسی طرح رائج رہیں۔ عباسی دور میں جب اس فن کو مزید ترقی ہوگئی، اور حروف کی پہچان کیلئے الگ علامات کی ضرورت پڑی، تو امام خلیل بن احمد فراھیدی نے نقاط کو حرکت کی بجائے حروف معجم (1) اور مہمل (2) کے درمیان فرق واضح کرنے کیلئے مقرر کر دیا، اور فتحہ کے لیے حرف کے اوپر ایک لمبی لکیر کی شکل دے دی۔ اسی طرح کسرہ کو حرف کے نیچے لمبی لکیر کی شکل دی، اور ضمہ کے لیے چھوٹے سے واؤ کی صورت تجویز کر دی۔ ایسے ہی ہمزہ کو عین کے مخرج کے قریب ترین ہونے کی وجہ سے راس العین کی شکل (ء) دے دی۔ جبکہ اس سے پہلے ہمزہ اور الف کی کتابت میں فرق نہ تھا۔ اور مشکل اس وقت پیش آتی تھی جب وہ دونوں اکٹھے آجائیں، تو قواعد رسم کے مطابق ایک کو محذوف الشکل لکھتے تھے مثلاً ”جاء شاء“

کی کتابت اگر اس طرح ہوتی "جاا شا" تو ہمزہ اور الف اکٹھے ہیں، اور متماثل فی الشکل ہیں، دونوں میں سے ایک کو محذوف الشکل لکھتے ہوئے "جااور شا" کتابت کرتے تھے۔ جبکہ غیر عرب کیلئے یہ بڑا مشکل عمل تھا۔ تو خلیل بن احمد نے ہمزہ کی الگ شکل وضع کر دی اس طرح کتابت اور قراءت دونوں کا مسئلہ حل ہو گیا۔[1]

قرآن حکیم کی وجوہ اعجاز

متقدمین اور متاخرین کے ہاں یہ بات مختلف فیہ ہے کہ قرآن حکیم کا اعجاز کس اعتبار سے ہے ؟ اس میں ہر طبقے نے اپنے مذاق کے مطابق اعجاز قرآنی کو ثابت کیا، جس کی تلخیص کی جائے تو یہ چار اقسام بنتی ہیں۔

1۔اعجاز بیانی 2۔اعجاز علمی تجربی 3۔اعجاز غیبی 4۔اعجاز تشریعی

1۔اعجاز بیانی

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم اپنی فصاحت و بلاغت میں معجزہ ہے۔ چنانچہ اس کا موازنہ جاہلیت کے شعراء سے کیا جائے، تو فرق نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً

الف۔ایجاز واختصار

یہ فن بلاغت کی اصطلاح ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ تھوڑے کلمات میں بہت گہری اور وسیع ترین حقیقت سمجھادی جائے۔ اس کی مثال کے طور پر اکثر ﴿اِنَّآ اَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ﴾ کے بلاغی نکتے بیان کئے جاتے ہیں۔

ب۔تشبیہ

یعنی کلام میں ایک غیر مادی حقیقت کو کسی مادی چیز کے ساتھ مشابہت دے کر مخاطب کے ذہن میں راسخ کرنا۔ جیسے ﴿اِنَّمَا مَثَلُ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا كَمَآءٍ اَنۡزَلۡنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ﴾[2]

ج۔نظم قرآنی

اس کا مقصد یہ ہے کہ قرآن حکیم اپنی ترتیب اور ترکیب حروف و کلمات میں تمام کلاموں سے فائق ہے۔[3]

---

1 المحکم فی نقط المصاحف: ص: 83

2 سورة یونس : 24

3 معترک الاقرآن فی اعجاز القرآن :1: 300

اس انداز فکر کا آغاز اس وقت ہوا جب واصل بن عطاء نے بصرہ میں یہ بات مشہور کی کہ قرآن حکیم فی نفسہ معجزہ نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے مخاطبین سے قوت معارضہ سلب کرلی تھی، اس لیے وہ اس کا مقابلہ نہ کرسکے۔ اس نظریہ کو بعد میں ابراہیم بن سیار النظام نے بہت پھیلایا۔ لیکن اس کے ایک شاگرد جاحظ نے پہلی دفعہ نظم القرآن کے عنوان سے کتاب لکھی اور مذکورہ نظریہ پر رد کیا، اور یہ ثابت کیا کہ قرآن حکیم فی ذاتہ معجزہ ہے۔

اس کے بعد محمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ نے تاویل مشکل القرآن کتاب لکھ کر قرآن حکیم کے ادبی اور بلاغی اعجاز کو نمایاں کیا۔ اس کے بعد پہلی مرتبہ اعجاز القرآن البیانی کے مخصوص عنوان سے ابو عبداللہ محمد بن یزید واسطی کی تصنیف منصۂ شہود پر آئی پھر تسلسل سے عبداللہ بن داؤد سجستانی نے نظم القرآن کے عنوان سے، اسی طرح ابو زید بلخی احمد بن سلمان اور ابو بکر احمد بن علی المعروف ابن الاخشید نے بھی نظم القرآن ہی کے عنوانات سے کتابیں لکھیں۔ یہاں تک کہ محمود بن عمر جار اللہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ نے "الکشاف عن حقائق التنزیل" کے پر کشش عنوان سے، بلاغیات کی روشنی میں قرآن حکیم کی مکمل تفسیر لکھی۔ قرآنی رسم الخط کا خلاف عادت عرب ہونا بھی اس قسم میں داخل ہے، کہ اس کا تعلق بھی لغوی اور بلاغی نکات سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسم عثمانی عام قواعد کتابت کے خلاف لکھی گئی ہے، وہاں محققین نے اس کی بلاغی توجیہ کی ہے اور اس کے اعجاز کی طرف اشارہ کیا ہے چنانچہ ﴿وَ السَّمَآءَ بَنَيۡنٰهَا بِاَيۡىدٍ﴾[1] میں، خلاف معمول دو یاء کے ساتھ لکھا گیا ہے، جس کی یہ توجیہ کی گئی ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی انتہائی زبردست قوت کی طرف اشارہ ہے۔ اس لیے کہ بلاغی اصول ہے: "کثرۃ المبانی تدل علی کثرۃ المعانی" کہ حروف والفاظ کی زیادتی معنیٰ کی قوت اور زیادتی پر دلالت کرتی ہے۔[2] یہ اعجاز کا نظریہ اپنی جگہ ایک حقیقت مسلمہ ہے جس کا انکار ناممکن ہے۔ البتہ قرآن کریم کے اعجاز کو اس میں منحصر ماننا یقیناً محل نظر ہے۔ اس لئے کہ اس کا تعلق صرف عرب کیساتھ ہے اور قرآن حکیم کا اعجاز کل انسانیت کیلئے ہے۔

2۔ اعجاز علمی تجربی

یعنی قرآن کریم کا موجود سائنسی حقائق کے مطابق ہونا، کہ جس قدر سائنسی حقائق منکشف ہو رہے ہیں،

---

1 سورة الذاريات :47

2 مناهل العرفان : 1: 263

اس قدر قرآن کریم کی تصدیق ہو رہی ہے۔ اس نظریے کے روح رواں اور اس کے پرچار کرنے والے علامہ طنطاوی جوہری مصری رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ قرآن حکیم اپنے مفاہیم اور مطالب و مقاصد کی وضاحت اور مخاطبین کے اذھان میں اس کو راسخ کرنے کیلئے متعدد انواع کے استدلال کرتا ہے، جن میں سے ایک کائنات کی حرکات و سکنات اور تغیرات بھی ہیں اور پھر ان میں سے غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ تاکہ اس میں غور و فکر سے انسان اس نتیجے پر پہنچ سکے، جو قرآن حکیم کا مقصود اصلی ہے۔ یقیناً اس غور و فکر کے راستے پر چلنے کیلئے ایک عاقل انسان، تمہیدی اور اساسی ضابطے بھی وضع کرتا ہے اور مفروضے بھی طے کرتا ہے۔ اور عقلی ترقی کے ساتھ ساتھ بسا اوقات اپنے طے کردہ ضوابط یا مفروضوں کو تنقید کا نشانہ بھی بناتا ہے۔ اور اس طرح دوسرے ضوابط اور مفروضے وضع کرتا ہے۔

اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ قرآن حکیم اپنی بات سمجھانے میں انسانی عقل کے ایجاد کردہ ضابطوں کا محتاج ہے، کہ جب تک یہ سائنس کی مادی جزئیات نہیں سمجھ آئیں گی تو قرآن حکیم کا سمجھنا ممکن ہو گا۔ لہٰذا قرآن حکیم پڑھنے سے پہلے، فزکس، کیمسٹری اور دیگر سائنسی علوم و فنون حاصل کئے جائیں، پھر قرآن حکیم کا مطالعہ کیا جائے اور چونکہ یورپ جدید سائنس کا بانی ہے، لہٰذا قرآن فہمی کا بانی بھی وہی ہوا۔ یہ رائے تو کسی صورت درست قرار نہیں دی جاسکتی۔ دوسرا یہ کہ قرآن حکیم کے مقاصد و مطالب کو سمجھنے کیلئے عقلی تدبر اور غور و فکر سے کام لیا جائے اور اس کے آیات کو نیہ سے طریق استدلال کو سمجھا جائے، لہٰذا ہر دور کا عاقل، جس کو انسانی سماج کا کوئی مسئلہ درپیش ہو، تو قرآن حکیم میں غور و فکر کر کے اس کا حل نکال سکتا ہے۔ تو اصل یہ سائنسی مادی جزئیات نہیں ہیں، اصل چیز قرآن حکیم کی بتائی ہوئی سیاسی، معاشی، سماجی تشکیل کی راہ نمائی ہے، چونکہ وہ راہنما کتاب ہے۔ اس کا کام انسان کے فطری ارتقاء کو ہر شعبہ میں جاری و ساری رکھنا ہے۔ اس کے لیے ہر دور کا انسان اپنے اپنے ادوار کی عقل و فہم کو استعمال میں لا کر یہ مقصد قرآنی حاصل کر سکتا ہے دونوں نتائج میں فرق نمایاں ہے۔

3۔ اعجاز غیبی

ایسی غیبی باتوں کی اطلاع دینا، جن کے ادراک اور پہنچ کیلئے عقل انسانی کے پاس سوائے وحی کے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ چاہے ان کا تعلق ماضی کے حقائق سے ہو یا مستقبل سے، چنانچہ انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کی امتوں کے مفصل واقعات اس پر شاہد عدل ہیں۔ بسا اوقات مکہ کے منکرین، اہل کتاب سے اسی طرح کے سوالات حاصل

کرتے تھے اور یہ جاننے کی کوشش کرتے تھے کہ آپ ﷺ نبی بر حق ہیں یا نہیں، ایک موقع پر یہود نے ان سے کہا کہ ان سے اصحاب کہف، ذوالقرنین اور روح کے متعلق سوال کرو کہ ان کی تفصیلات سوائے نبی مرسل کے کوئی نہیں جانتا۔ جس کے جواب میں سورۃ الاسراء کی آیات اور سورۃ الکہف اتری۔[1] اور اسی طرح مستقبل کے غیب پر مبنی اطلاعات بھی قرآن حکیم کے اعجاز پر دلالت کرتی ہیں۔ مثلاً مکی سورت میں مستقبل کی کامیابی اور مخالفین کی ناکامی کی نوید سنانا۔

﴿سَيُهۡزَمُ الۡجَمۡعُ وَ يُوَلُّوۡنَ الدُّبُرَ﴾[2] ﴿ وَ اللّٰهُ يَعۡصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾[3] ﴿ قُلۡ لِّلۡمُخَلَّفِيۡنَ مِنَ الۡاَعۡرَابِ سَتُدۡعَوۡنَ اِلٰى قَوۡمٍ اُولِىۡ بَاۡسٍ﴾[4]

4۔اعجاز تشریعی

قرآن حکیم کا اعجاز یہ ہے کہ اس نے انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ عقیدہ سے لے کر ازدواجی زندگی، تجارتی زندگی، اخلاق اور معاملات کی زندگی کے متعلق جہاں راہنمائی کی ہے، وہاں قوموں کے درمیان جنگ اور امن کے معاہدات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور ان تمام چیزوں کو ایسے پر کشش انداز سے بیان فرمایا کہ سمجھنے والے کے ذہن میں اترتا چلا جاتا ہے۔[5] درحقیقت قرآن حکیم کا اعجاز کسی ایک وجہ میں منحصر نہیں ہے۔ یقیناً اس کا اعجاز بلاغی بھی ہے غیبی اور تشریعی بھی ہے تاہم اعجاز بلاغی کا حقیقی ادراک تو اہل لغت کو ہی ہو سکتا ہے، غیر عرب اس ادراک کی گہرائی تک کسی صورت نہیں پہنچ سکتے۔[6]

---

1 الجواهر فی تفسير القرآن الكريم : 25: 56
2 سورة القمر :45
3 المائده :67
4 سورة الفتح :16
5 الباب النقول فی اسبا ب النزول: ص: 155
6 مباحث فی اعجاز القرآن : 221۔246

رسم کے قواعد ستہ اور قرآن کریم کا اعجاز

1۔حذف کا قاعدہ

قاعدہ رسم یہ ہے کہ حروف مدہ کسی کلمہ کے درمیان میں آجائیں یا حروف متماثل فی الرسم اکٹھے آجائیں، تو ایک کو کتابتاً حذف کر دیا جاتا ہے مثلاً

1۔یأیھاالناس میں یائے ندا کا الف حذف کر دیا گیا ہے، اور یأیھا کا ہمزہ بشکل الف لکھ دیا گیا ہے(قال رجلٰن)[1] میں لام کے بعد الف مدہ کے حذف کے ساتھ لکھا گیا ہے۔الرحمن ہمیشہ حذف الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔

ب۔واؤ مدہ بھی درمیان کلام میں اپنے مماثل کے ساتھ آجائے تو اس کو حذف کر دیا جاتا ہے۔جیسے ﴿اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُنَ﴾[2] کہ دراصل دو واؤ کے ساتھ لا یستؤون ہے ایسے ہی ﴿فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَ الْغَاوٗنَ﴾[3] دراصل والغاؤون دو واؤ سے ہے(وقتل داؤد) سورۃ الشعراء :94 دراصل داؤد دو واؤ کے ساتھ ہے، ایک کو حذف کر دیا جاتا ہے۔(فأؤا)(البقرۃ :251)دراصل فأْوُوْا دو واو کے ساتھ ہے۔(یلؤن)(الکھف :16)دو واؤ کے ساتھ ہے وغیرہ۔

ج۔کبھی کسی اسم یا فعل میں یاء زائدہ آجائے تو قراءت کے ساتھ کتابت میں بھی اس کو حذف کیا جاتا ہے۔جیسے ﴿اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾[4] دراصل دعانی، ﴿وَ اسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ﴾[5] دراصل المنادي، ﴿وَ الَّيْلِ اِذَا يَسْرِ﴾[6] دراصل یسری ہے وغیرہ۔

1 الفوز الکبیر فی اصول التفسیر :ص: 137
2 سورۃ المائدہ: 23
3 سورۃ الم السجدہ : 18
4 سورۃ آل عمران: 78
5 سورۃ البقرۃ: 186
6 سورۃ ق: 41

د۔ حروف متماثل فی الرسم میں خصوصاً لام کو حذف کر دیا جاتا ہے، جیسے واللیل کو ایک لام کے ساتھ الیل، الذین دراصل اللذین دو لام کے ساتھ ہے، لیکن ایک لام کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ سورۃ الفجر: 4 یہ کتابت قدیم عرب کا دستور تھا۔ لیکن قرآن حکیم میں چند مثالیں ایسی ہیں جن پر قاعدہ منطبق نہیں ہوتا مثلاً سبحٰن ہر جگہ بحذف الف لکھا گیا ہے لیکن ﴿قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا﴾[1] میں الف کے ساتھ ہے، ایسے ہی اللہ، اللعنة وغیرہ میں باوجود متماثل فی الرسم ہونے کے دونوں لام لکھے گئے ہیں۔ اسی فرق عادت ہونے کا نام قرآن کریم کا اعجاز ہے۔

2۔ اضافہ کا قاعدہ

اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن حکیم میں کچھ حروف کسی نہ کسی علامت کے طور پر زوائد لکھے گئے ہیں، گو وہ پڑھنے میں نہیں آتے جیسے ﴿مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ﴾[2] یہ الف، واؤ جمع کی علامت کے طور پر ہے، لیکن ﴿وَّلَاَاْوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ﴾[3] ﴿اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗٓ﴾[4] ﴿ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ﴾[5] اور اس طرح کی دوسری مثالوں میں ایک حرف کا اضافہ ہے، جو کہ اہل عرب کے قواعدِ رسم کے خلاف ہے، اور کسی علامت کے طور پر مستعمل بھی نہیں ہے۔

3۔ ہمزہ بصورت عین (ء)

کی کتابت کا قاعدہ عرب میں معروف نہ تھا۔ اس لئے ان کے ہاں ہمزہ لکھنے کے معروف طریقے تھے۔ مثلاً ہمزہ ساکنہ، اگر فتحہ کے بعد ہو تو بصورت الف، اگر ضمہ کے بعد ہو تو بصورت واؤ اور کسرہ کے بعد بصورت یاء لکھا جاتا ہے۔ مثالیں بالترتیب یہ ہیں: البأساء ، اؤتمن ، ائذن۔ اسی طرح حرف متحرک کے بعد اپنی موافق حرکت کے اعتبار سے لکھا جاتا۔ مثلاً مضموم بصورت واؤ، جیسے نقرؤه ، يبدؤ، اور مکسور بصورت یاء جیسے سئل، لیکن اس کے برعکس کبھی محذوف الشکل لکھا گیا ہے۔ یعنی واؤ، الف اور یاء کی صورت کی بجائے درمیان سطر میں لکھا گیا ہے

---

1 حق التلاوة :ص: 241۔247
2 سورة الاسراء : 93
3 سورة البقرة : 46
4 سورة البراءة: 47
5 سورة النمل : 21

جیسے ملء الارض ، الخبء ، دفء وغیرہ۔ اور کبھی فتحہ کے بعد بصورت واؤ لکھا گیا ہے جیسے ﴿وَقَالَ الْمَلَؤُا﴾[1]
اسی طرح معروف قاعدہ کے مطابق ہمزہ متطرفہ جو الف کے بعد ہو وہ محذوف الشکل ہوتا ہے۔ جیسے ﴿وَ جَعَلُوا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ﴾[2] اور اکثر قرآن حکیم میں ایسا ہی ہے لیکن دو جگہ میں یہی کلمہ بصورت واؤ لکھا گیا ہے۔

1. ﴿زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا﴾[3] 2۔ ﴿اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ﴾[4]

4۔ بدل کا قاعدہ

الف واوی کو واؤ کے ساتھ اور الف یائی کو یاء سے بدل کر لکھتے ہیں ۔ جیسے الصلوۃ، الزکوۃ، الربو، والضحی وغیرہ، لیکن کلتا، عصانی، تترا میں واوی کو الف کے ساتھ ہی لکھا گیا ہے۔ اسی طرح (وَجَآءَ من اقصا المدينة) میں اقصا کو باوجود یائی ہونے کے الف کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

5۔ مقطوع وموصول کا قاعدہ

قرآن حکیم میں کئی جگہ دو حروف کو ملا کر لکھا گیا ہے، جبکہ دوسری بعض جگہوں سے جدا کر کے لکھا گیا ہے۔ جیسے ان کو لاسے دس جگہوں میں الگ کر کے لکھا گیا ہے، اور وہ یہ ہیں:

1۔ ﴿ اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ﴾[5] 2۔ ﴿ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ﴾[6] 3۔ ﴿ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ﴾[7] 4۔ ﴿اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ﴾[8] 5۔ ﴿اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ﴾[9] 6۔ ﴿اَنْ لَّا تُشْرِكْ

1 سورة الكهف :25
2 سورة المومنون :24
3 الانعام :95
4 سورة الانعام :101
5 سورة الشورى:21
6 سورة التوبه : 118
7 سورة الانبياء :87
8 سورة يٰس :60
9 هود : 26

بِيْ شَيْئًا ﴾[1] 7۔ ﴿ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ ﴾[2] 8۔ ﴿ وَّ اَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ ﴾[3] 9۔ ﴿ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَ دَرَسُوْا مَا فِيْهِ ﴾[4] 10۔ ﴿ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ﴾[5] اس حروف کو مذکورہ دس جگہوں کے علاوہ ملا کر لکھا گیا ہے۔ جیسے ﴿ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ﴾[6] ﴿ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَ اْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴾[7] اس نون کو ادغام کے ساتھ، کتابت میں بھی حذف کرنے کو، موصول کہا جاتا ہے اور اس سلسلے میں مصحف کی اتباع ضروری ہے کوئی قاعدہ معروفہ نہیں ہے۔

6- قاعدہ اختلاف قراءت

یعنی ایسا کلمہ جس میں متعدد قراءات ہوں تو ایسی رسم اختیار کرنا کہ وہ قراءات پر منطبق ہو سکے جیسے **فسسو** کو نقاط و اعراب کی تبدیلی کے ساتھ **فتبینوا** اور **فتثبتوا** دونوں قراءتوں میں پڑھا جا سکتا ہے۔ رسم میں دونوں کا احتمال ہے۔ مذکورہ بالا قواعد ستہ کے تناظر میں غور کیا جائے تو کئی ایک کلمات قرآنیہ عرب کی معروف کتابت کے اصول کے خلاف ہیں۔ اسی سے علماء رسم نے یہ رائے اختیار کی ہے کہ یہ بھی در حقیقت رسم کے باب میں قرآنی اعجاز ہے اور یقینا یہ اہل لغت یعنی عرب کیلئے ہے کہ اس کا تعلق عربی رسم الخط کے ساتھ ہے۔ مشہور عارف باللہ عبدالعزیز الدباغ[8] کے حوالے سے ان کے مرید مبارک لمطی نے کہا ہے کہ جب ان سے رسم قرآنی کی بابت سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: **"سر من اسرار اللہ"** مزید تاکید کرکے فرمایا کہ صحابہ یا کسی اور کا رسم قرآنی میں ایک بال برابر بھی نیا کام نہیں۔ یہ صرف نبی اکرم ﷺ کی طرف سے توقیف و تعلیم ہے۔ اور یہ صرف قرآن سے مخصوص ہے۔ استدلال میں انہوں نے فرمایا کہ مائۃ میں الف زائد کیوں ہے؟، جبکہ فئۃ میں نہیں ہے؟

---

1 سورة الممتحنه : 12

2 الحج: 62

3 سورة القلم : 24

4 الدخان : 19

5 سورة الاعراف : 169

6 سورة الاعراف: 105

7 سورة هود :2 - سورة النمل :31

8 الجواهر النقيه شرح المقدمة الجزريه : ص: 220۔252

﴿بِأَيِّكُمُ الْمَفْتُونُ﴾[1] اور﴿وَ السَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ﴾[2] میں یاء کیوں زائدہ ہے ؟﴿وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ﴾[3] میں 'سعوا' کے آخر میں الف کیوں زیادہ ہے ؟ جبکہ (سبا5) میں الف نہیں ہے: قرءانا (یوسف اور زخرف) میں ہمزہ کے بعد الف مرسوم نہیں ہے، جبکہ دیگر جگہوں میں الف بعد الھمزہ بھی لکھا گیا ہے ؟مزید فرمایا کہ اس کا ادراک عام عقول بشریہ کے بس سے باہر ہے اس راز کو خواص ہی پاسکتے ہیں۔ مناہل العرفان 1/375، محمد عبد العظیم زرقانی نے احمد بن المبارک کی تصنیف کتاب الابریز سے یہ بات نقل کی ہے۔ مذکورہ کتاب کے متعلق قاری اظہار احمد تھانوی مرحوم نے لکھا ہے کہ 1306ھ میں طبع ہوئی ہے لیکن سن طبع، مکان طبع وغیرہ کے متعلق کچھ نہیں لکھا: ایضاح المقاصد، ص40۔ اور اب میسر مکتبوں میں تلاش کے باوجود اصل کتاب کے متعلق علم نہ ہو سکا۔

1 سورة القلم : 6
2 سورة الذاريات : 47
3 سورة الحج: 51